نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں

(۴)

نعیم صدیقی

تزکیہ کتاب الٰہی کی تبیین کے فریضے کے تحت چوتھا بڑا شعبۂ کار جو انبیاء کو تفویض کیا جاتا رہا ہے اور محمد صلی علیہ وسلم کو تفویض کیا گیا ہے، تزکیہ کہلاتا ہے۔ اس فریضے کے نبی پر عائد ہونے کے صاف معنی یہ ہیں کہ نبی صرف کتاب پڑھ کر سنا دینے اور اللہ تعالیٰ کی وحی بندوں تک پہنچا دینے ہی کے لیے نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کی طرف سے خاص طور پر جیسے معلمِ کتاب وحکمت ہوتا ہے، ویسے ہی مزکّی بھی ہو کر آتا ہے

مبالغہ نہ ہوگا، اگر "تزکیہ" کو سارے کارِ نبوت کا اصل مقصود قرار دیا جائے۔ کیونکہ دین و شریعت اور بعثتِ انبیاء کی غایت الغایات فلاحِ انسانی ہے ـــــ دنیوی فلاح اور اخروی فلاح ـــــ اور اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ فلاح کا حصول "تزکیہ" پر موقوف ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (الاعلیٰ)، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (شمس)، لہٰذا بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء کی ساری کی ساری سرگرمیاں درحقیقت انسانی تزکیہ کے لیے ہیں۔

تزکیہ کا سیدھا سادہ مطلب زندگیاں سنوارنا ہے۔ اگر ہم لغوی معنی کی تحقیق کرنا چاہیں تو ہمیں اس مصدر کے دو معنی حاصل ہوتے ہیں:۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔ منفی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو کسی مقصود کے لیے مضرات و مفاسد سے پاک کرنا، یا اس کو ان رکاوٹوں سے خالی کرنا جو اس مقصد کی راہ میں حائل ہوں۔ جیسے کسی زمین کا تزکیہ یہ ہوگا کہ اس میں ہل چلا کر اس کی سختی کو ختم کیا جائے، اس کے ڈھیلے توڑ دیے جائیں، اس کی ناہمواری کو ہمواری میں بدلا جائے، اس میں اگر سرکنڈے اُگ رہے ہوں تو ان کی جڑیں کھود دی جائیں، اس کی مینڈیں استوار کر دی جائیں، غرضیکہ اسے کاشت کے لیے بالکل تیار کر دیا جائے۔ مثبت معنی یہ ہیں کہ کسی

چیز کو کما حقہٗ نشوونما دی جاسکتی ہے۔ اس کی ترقی کے تمام لوازم جمع کردیے جائیں، اور اسے پروان چڑھانے کے لیے جن تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے، ان کو پورا کر دیا جائے۔ لیکن یہ دونوں معنی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا نہیں، بلکہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ مفاسد و مضرات سے کسی شے یا وجود کو پاک کرنے کا لازمی نتیجہ اُس کا نشوونما ارتقا ہے، اور کسی شے یا وجود کو نشوونما ارتقا دینے کا اوّلین تقاضا اسے مفاسد و مضرات سے پاک کرنا ہے۔ یہ دونوں معنی لفظ تزکیہ کے اندر باہم گھل مل جاتے ہیں۔ چنانچہ زکوٰۃ ایک طرف اس معنی میں پاک کرنے والی ہے کہ وہ اُن جذبات کی جڑ اکھیڑتی ہے جو انسانی فلاح میں حائل ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس معنی میں نشوونما دینے والی ہے کہ وہ تعلق باللہ کو، افراد معاشرہ کے درمیان رابطۂ اخوت و مودت کو اور مجموعی خوش حالی کو ترقی دیتی ہے۔

انسانی زندگی کا تزکیہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی کے خیر و فلاح کی طرف بڑھنے اور اس کی بہترین صلاحیتوں کے نشوونما پانے میں جو رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں ان کا ازالہ کرکے وہ تمام اسباب بہم پہنچا دیے جائیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقا کے لیے ضروری ہیں۔ اچھے خیالات کے ارتقا میں جو خیالات حائل ہوں، پاکیزہ جذبات کے ترقی کرنے میں جو سفلی جذبات رکاوٹ بنیں، اخلاق عالیہ کی بڑھوتری میں جو عادات، رسوم اور روایات مانع ہوں، ان کو چن چن کر دور کر دیا جائے اور انسانی فطرت کی بہترین صلاحیتوں اور تمدن کے قابل قدر پہلوؤں کے نشوونما کے لیے تمام لوازم جمع کر دیے جائیں۔

اس مفہوم کو سمجھنے میں ہم الاحزاب کے چوتھے رکوع سے بڑی مدد لے سکتے ہیں۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے اہل بیت کو خاص ہدایات دی ہیں اور بعض چیزوں سے روکا ہے اور بعض کی بشدت تاکید کی ہے۔ اور پھر اختتامی کلمہ یہ فرمایا ہے کہ:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا	اے نبی کے گھر والو! اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے میل کچیل دُور کرکے تم کو کمال درجہ میں پاک کر دے۔

یعنی اللہ تعالیٰ میل کچیل نکال کر کامل درجے کی پاکیزگی سے ازواج مطہرات کو اور پھر ان کے ذریعے امت کی تمام مستورات کو نوازنا چاہتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہاں میل کچیل سے مراد فاسد خیالات،

جو جسمانی قوتیں رکھتا ہے وہ جسمانی قوتوں سے خدمات انجام دے، جو ہاتھ پاؤں سے کوئی خیر انجام دے سکتا ہے وہ ہاتھ پاؤں سے انجام دے، جو زبان سے دوسروں کے کام آسکتا ہے وہ زبان سے دوسروں کے کام آئے۔

چنانچہ آنحضورؐ نے اپنے دوسرے فرمودات میں واضح کیا ہے کہ راستے سے روڑے اور کانٹے ہٹا دینا، کسی کو بوجھ اٹھوا دینا، کسی کو راستہ دکھا دینا، بلکہ کسی سے خندہ روئی سے پیش آنا بھی صدقہ ہے۔

اس طرح کی احادیث کا منشا تصورِ صدقہ کا تزکیہ ہے۔ جہاں صدقہ کا یہ صحیح اور جامع تصور ذہن نشین ہوگا اور وہاں صدقہ کی اسپرٹ اور اس کا جذبہ نشو و نما پانے لگے گا اور سوسائٹی پر فلاح کے دروازے کھل جائیں گے۔

چوتھی مثال | آنحضورؐ کی تحریک جب جہاد کے مرحلے سے دوچار ہوئی ہے تو اس مرحلے میں آکر نفسِ انسانی کے بہت سے قابلِ اصلاح پہلو ایسے سامنے آئے ہیں جو دوسرے مراحل میں کبھی نمایاں ہو ہی نہ سکتے تھے چنانچہ ایک طرف قرآن نے اور اس کے زیرِ ہدایت خود آنحضورؐ نے ان پہلوؤں کا تزکیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ترمذی کی یہ حدیث بڑی قابلِ غور ہے:

من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات، مات ميتة الجاهلية، ومن قاتل تحت رأية عمية يغضب لعصبية أو يدعو إلى عصبية فقتل، فقتلة جاهلية . . . الخ

جو کوئی اسلامی نظامِ اطاعت سے نکل گیا اور جماعت کے ڈسپلن سے باہر ہوگیا اور پھر وہ مرگیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جو کوئی کسی نامعلوم جھنڈے کے نیچے لڑے اور جس کا سارا جوش قومی و نسلی عصبیت کی وجہ سے ہو، یا جو جہاد کے لیے کسی عصبیت کی طرف بلاتا ہو اور پھر وہ مارا جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہ جہاد کی تنظیمی اور فوجی نظام اور میدانِ جنگ کی سرگرمیوں کا تزکیہ کیا جا رہا ہے۔ آنحضرتؐ تنبیہ فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کو بدنظمی اور ہلڑ سے منافات ہے۔ پھر واضح فرماتے ہیں کہ جنگ برائے جنگ کے اصول پر یا پیشہ ورانہ طریق پر، ہر جھنڈے کے نیچے جا لڑنے والا اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر نہ رکھنے والا سپاہی شجاعت کے جو جوہر دکھاتا ہے جاہلیت کی راہ میں دکھاتا ہے اور مرتا ہے تو کفر پر مرتا ہے۔ اسی طرح وہ جنگجو جس کا سارا جوشِ جنگ کسی قومی و نسلی عصبیت کا نتیجہ ہو، یا جو ایسی کسی عصبیت کی طرف پکارتا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مرے گا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو کر نہیں مرے گا۔ بلکہ کفر کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھے گا!

ان کو یہ جواب دیتے ہیں:

قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ[1] وَغَضَبٌ (الاعراف - ۷۱)

تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے ناپاکی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب کا ورود تو بس اب ہو چکا۔

یعنی تمہارے دلوں پر ایسی فکری اور جذباتی غلاظتیں تسلط پا چکی ہیں کہ اب یہاں ایمان جیسی لطیف شے کا گذر ممکن نہیں رہا۔ تمہاری زندگیوں میں اب بداخلاقی کی جھاڑیوں کا اتنا گھنا جنگل اُگ چکا ہے کہ یہاں اب گلاب و یاسمن پھلنے سے رہے۔ تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو، حالانکہ یہ ایک حالتِ عذاب ہی تو ہے جس میں تم گھر چکے ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی تو ہے جس میں تم مبتلا ہو رہے ہو اور چاہتے کیا ہو؟

عکس مومنین اور منافقین کا متقابلہ نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۞ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ۔ (التوبہ - ۱۲۴-۱۲۵)

اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو (باہم گفتگو کرتے ہوئے) کہتے ہیں کہ اس کے اترنے سے کس کس کے ایمان میں اضافہ ہوا؟ ۔ سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا تو ایمان بڑھا ہی ہے اور وہ اس سے اچھی بشارت پاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے تو ان کی ناپاکی پر ناپاکی کی ایک اور تہ چڑھ جاتی ہے اور وہ مرتے ہیں تو کافر ہو کر مرتے ہیں۔

دیکھیے آیت نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ جن دلوں میں نفاق کی گندگی موجود ہوتی ہے وہ آیاتِ الٰہی کے فیضان سے محروم رہتے ہیں، یعنی آیاتِ الٰہی سے ان کا تزکیہ نہیں ہوتا، بلکہ اُلٹے ان کے دل اور ناپاک ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں ایمان اور عمل صالح کو نشوونما دینے کی صلاحیت بالکل مر جاتی ہے چنانچہ

---

[1] رجس کا ترجمہ بلفظ عذاب بھی کیا جاتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ حالتِ رجس خود عذاب ہی ہوتی ہے، یا کم سے کم عذاب کا پیش خیمہ۔ اس آیت میں پہلے رجس کا ذکر ہے اور پھر غضب کا۔ اس ترتیب کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے خیالات اور اخلاق کی ناپاکی یا تزکیہ سے محرومی کی حالت نمودار ہوتی ہے اور پھر اس کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ورود ہوتا ہے

وہ دعوئے ایمان کے باوجود بحالتِ کفر مرتے ہیں اور آخرت کی عدالت میں کافری کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں

یہ جس چیز کا ذکر "رجس" کے لفظ سے ان آیات میں کیا گیا ہے، اسی سے انسانی زندگی کو پاک کرنے کا کام ایک نبی سر انجام دیتا ہے۔ وہ رجس کی حالت سے نکال کر افراد کے نفوس کو اور نظامِ اجتماعی کو طہارت کے مقام پر لاتا ہے۔ یہاں تک کہ بھلائیاں نشوونما پانے کے لیے پوری طرح ایک سازگار فضا چاروں طرف پھیلی ہوئی پاتی ہیں جس میں برائیاں خود بخود سوکھتی اور مرتی ہیں۔

تزکیہ کا صحیح تصور | ہم سنت کے کارِ تزکیہ کا ایک اجمالی مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ تزکیہ کا صحیح تصور سامنے لے آئیں۔ اس اصطلاح کا جو مفہوم آج کل رائج ہے اسے قرآن کے دیے ہوئے تصور سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ یہ مفہوم قرآنی تصور سے ٹکراتا ہے۔ حقیقت کی توضیح کے لیے ہم یہاں چند ضروری اشارات درج کرتے ہیں:

۱۔ تزکیہ کا کوئی فلسفہ، علم، فن، یا طریق کار کتاب و سنت کی حدود سے ماوراء نہیں ہے۔ انسانی تزکیہ کے لیے جو جو اصول اور طریقے برحق اور ممکن العمل اور نتیجہ خیز ہیں وہ سب کتاب و سنت میں واضح کر دیے گئے ہیں۔ یہی کاوشِ اور کتاب و سنت کا مقصدِ نزول ہی جب تزکیہ ٹھہرا تو پھر اگر خدا کی کتاب اور نبی کی سنت ہی تزکیے کا لوازم ہم تک نہ پہنچائے تو اور کہاں سے اس جنس کو ڈھونڈا جائے گا

۲۔ تزکیہ کا کام ایک شعوری عقلی اور استدلالی کام ہے۔ چنانچہ خود قرآن جو تمام تر انسانی خیالات، جذبات اور اخلاق و اعمال کے تزکیہ کے لیے وقف ہے، اس مقصد کے لیے اول تا آخر استدلال سے کام لیتا ہے اور عقلِ انسانی کو اپیل کرتا ہے۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ تزکیہ سے محروم وہ لوگ رہتے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے اور استدلال سے استفادہ نہیں کرتے (ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون یونس ۱۰۰) پس یہ کوئی ایسا پُراسرار کام نہیں ہے جس کے لیے "چشم بند و لب بہ بند و گوش بند" کی ضرورت پیش آئے۔ تزکیے کے لیے آنکھیں بند کرنا نہیں، آنکھیں کھولنا ضروری ہے۔ یہ شعبدوں اور کرامات کی دنیا نہیں ہے کہ آدمی بس مسحور ہو جائے، یہ تو ذہن کی قوتوں کو بیدار کر کے ان سے پوری طرح کام لینے کی دنیا ہے۔ تزکیہ

کوئی خفیہ اسکیم نہیں ہے کہ اسے سینہ بسینہ لے کے چلا جائے اور ایک انڈر گراؤنڈ مہم جاری رکھی جائے یہ خلوت کا ساز نہیں، جلوتوں کا معرکہ ہے۔

۳۔ تزکیہ انسانی زندگی کے کسی ایک گوشے میں مطلوب نہیں، ہر بہت سے اور ہر پہلو میں مطلوب ہے۔ یہ تصور بڑا ہی غلط اور گمراہ کن تصور ہے کہ زندگی کے محل میں آپ ایک خاص اندھیری کوٹھڑی تزکیہ کے لیے خاص کر لیں، اور پھر اس کی ظلمتوں میں ڈوب کر الا اللہ کی ضربیں لگاتے رہیں۔ اس کوٹھڑی میں تو خوب جھاڑ بہار ہوتی رہے، اس کی صفائی و درستی کے لیے تو دن رات مشقیں اور ریاضتیں کی جائیں، لیکن باقی سارا محل غلاظتوں سے پٹا پڑا رہے اور اس میں کھیاں بھنبھناتی رہیں۔ یہ تصور تزکیہ دنیا کے اُن مذاہب کا ہے جنہیں لوگوں نے بگاڑ بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اسلام کا تصور تزکیہ یہ ہے کہ زندگی کا سارا ہی ایوان طہارت و نظافت کی حالت میں رہنا چاہیے۔

آپ فرد کو اپنی تزکیہ گاہوں میں لا کر جب اس کا تزکیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پہلے خدا کے سامنے اس کے عبد ہونے کی حیثیت کو اس کی ساری تمدنی حیثیتوں سے منقطع کرتے ہیں۔ وہ خدا کا عبد ہوتے ہوئے ایک خاندان کا فرد، ایک بیوی کا شوہر، کچھ بچوں کا باپ، کچھ اعزہ کا قرابت دار، کسی منڈی کا تاجر، کسی کارخانے کا مزدور، کسی دفتر کا کلرک، ایک نظامِ عدالت کا جج، کچھ انجمنوں اور جماعتوں کا رکن، ایک حکومت کا محکوم، ایک قانون کا تابع، ایک معاشرے کی روایات و رسوم کا گرفتار بھی تو ہے۔ اس کے دوسروں سے لین دین ہیں، اس کے حقوق و فرائض ہیں، اس کی قرابتیں اور عداوتیں ہیں، اور وہ بے شمار معاملات کے بندھنوں سے بندھا ہوا ہے۔ ان معاملات ہی سے تو رجس پیدا ہوتا ہے اور ان معاملات ہی کے اندر تو وہ تزکیہ کا محتاج ہے۔ جس سماجی فریم کے اندر وہ ہر چہار جانب سے مختلف رشتوں اور تاروں اور کیلوں اور پیچوں کے ذریعے کسا ہوا ہے، اسی فریم کے اندر ٹھیک رہنے کے لیے ہی تو وہ تزکیہ کا محتاج ہے۔ لیکن آپ نے اگر اسے اس فریم سے ہی الگ کر ڈالا تو اب تزکیہ کا ہے کا؟ آپ زندگی کے تالاب کی ایک مچھلی کو اس کے تالاب سے باہر نکال کر اسے تیرنا سکھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک مضحکہ انگیز کارروائی نہیں تو کیا ہے۔

فرد کو تمدن سے الگ کر کے ہم سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہ جو کچھ ہے نظامِ تمدن کے اندر رہ کر ہے۔ اس کی

مشکلات جتنی بھی ہیں وہ اسی نظامِ تمدن کے نرغہ میں رہتے ہوئے ہیں۔ اس کے مسائل یہیں پیدا ہوتے ہیں اور یہیں اپنا حل چاہتے ہیں۔ اس کا مل اگر غلاظتوں سے ملوث ہو جاتا ہے تو اسی تمدن کے زیر اثر۔ اور اسے اگر اپنی روح کی تطہیر مطلوب ہے تو اسی کے اندر رہنے کے لیے! اس حقیقت کو اگر آپ مان لیں تو پھر یہ بھی ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ تزکیہ درحقیقت وہ ہے جو پورے نظامِ حیات کو گندگیوں سے پاک کر کے اس کی صحیح نشوونما کے سامان بہم پہنچا دے۔ مانا کہ تزکیہ کا مدعا یہ ہے کہ خود ایک ایک فرد کی بہترین صلاحیتوں کو ارتقاء کے راستے پر ڈالنا اور اس راستے سے مختلف مزاحمتوں کو دور کرنا ہے، لیکن فرد کا تزکیہ بجز اس کے ممکن ہی نہیں کہ پورے کے پورے نظامِ تمدن کا تزکیہ کیا جائے۔ تزکیہ فلسفہ و علوم کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ نظامِ تعلیم کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ عدالت و قانون کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ قیادت و امارت کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ مارکیٹ کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ خاندانی فضا کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ ادب اور لٹریچر کا بھی ہونا چاہیے، تزکیہ رسوم و اطوار کا بھی ہونا چاہیے ــــ جب اس طرح نظامِ اجتماعی کا ہر جہتی تزکیہ ہو جاتا ہے تب جا کر ایسی سازگار فضا بنتی ہے جس میں ہر ہر فرد کی پاکیزہ صلاحیتیں نشوونما پائیں اور ایمان و عمل صالح کے پودے پوری طرح برگ و بار لائیں۔

چنانچہ اسلام نے تزکیہ کا یہی وسیع تصور دے کر ایک جامع منصوبہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ تزکیہ کی اسلامی اسکیم میں جتنی اہمیت افراد کی ذہنی اصلاح کی ہے، اتنی ہی اہمیت نظامِ جماعت کی مضبوطی و درستی کی بھی ہے۔ یہاں ایک طرف اگر تزکیہ کے تقاضے نماز سے پورے ہوتے ہیں تو دوسری طرف بعض وسیع تر تقاضے جہاد سے پورے ہوتے ہیں۔ یہاں اگر تزکیہ کا ایک کورس مکی ہے تو دوسرا وسیع تر اور اعلیٰ تر کورس مدنی بھی ہے۔ یہاں اگر غارِ حرا اور دارِ ارقم کی خانقاہوں سے گزرنا پڑتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بدر و اُحد کی خانقاہوں کی تربیت پانا بھی ناگزیر ہے۔ یہاں آغاز فاران کی چوٹی سے ایک پکار سے ہوتا ہے اور خاتمہ جمعۃ الوداع کے خطبے پر ہوتا ہے۔ یہاں اگر ایک دن مظلومی کی حالت میں ہمہ تن صبر بن کر گھر چھوڑنا پڑتا ہے تو دوسرے دن قوت و جبروت کے ساتھ اسی گھر میں فاتحانہ داخلہ بھی ہوتا ہے۔

اسلامی تصورِ تزکیہ کی وسعت سمجھ لیں تو پھر آدمی خود بخود یہ حقیقت پا لیتا ہے کہ سارے کا سارا دین

ایک نظام تزکیہ ہے قرآن کی ایک ایک آیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول و فعل انسانی تزکیہ ہی کے مطلوب کی طرف رُخ کیے ہوئے ہے۔ تزکیہ دین کی کوئی شاخ نہیں، بلکہ یہی پورے کا پورا دین ہے۔ جب تزکیہ پورے کا پورا دین ہے تو اس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ کچھ لوگ دین کے باقی کاموں کو شریعت کا نام دے کر الگ چھوڑ دیں اور تزکیہ کو ایک جداگانہ کام کی حیثیت سے طریقت کا نام دے کر اس میں اختصاصی مہارت پیدا کر کے بیٹھ جائیں کہ یہ خاص ڈیپارٹمنٹ ہمارا ہے۔ پھر اس کا ایک مستقل فن مدون کریں اور اس فن کے ماہرین کو تیار کر کے اس پر مامور کریں کہ وہ جا بجا تزکیہ کے ورکشاپ کھول کر بیٹھ جائیں۔

تزکیہ کوئی ٹیکنیکل شغل نہیں ہے۔ اس کا کوئی لگا بندھا کورس اور فارمولا نہیں ہے۔ اس کی کوئی متعین ورزشیں اور مشقیں نہیں ہیں کہ جس طرح جسمانی شکل کی بعض مقررہ ورزشوں اور مشقوں سے بدن بنایا جاتا ہے اسی طرح آپ چند روحانی ورزشوں اور مشقوں سے اپنی روحانیت کو بنائیں۔ یہ زندگی کی ہر جہتی تطہیر اور تعمیر کا کام ہے اور خدا کے انبیاء ساری عمر یہی ایک کام کرتے ہیں، اپنے قول سے بھی اپنے عمل سے بھی، دعوت و تبلیغ کے ذریعے بھی، تنظیم جماعت کی صورت میں بھی، عدالت اور جہاد کے امور مہمہ کی انجام دہی کی شکل میں بھی!

چنانچہ قرآن نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کار تزکیہ کی وسعتوں کو جن خاص خاص مواقع پر اپنے بیان میں سمیٹ کر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ایک اہم موقع پر آنحضور کی بعثت کا مدعا یوں بیان کیا گیا ہے:

— یَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ	وہ نبی، ان کو معروف کا حکم دیتا ہے۔
— وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ	ان کو منکر سے روکتا ہے۔
— وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	اور طیبات کو ان کے لیے حلال کرتا ہے۔
— وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ	اور خبائث کو ان کے لیے حرام ٹھہراتا ہے۔
— وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	اور ان کے اوپر سے ان کے وہ بوجھ اور بندھن اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے ہیں۔

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ معروف اور منکر کی تمیز پیدا کر دیں، اور پھر معروف کی طرف بلائیں اور منکر سے روکیں۔ اسی طرح انسانیت کو طیبات اور خبائث کا شعور دلائیں اور پھر طیبات میں سے جن جن چیزوں کو نظام زندگی میں کسی طاقت نے حرام کر دیا ہو ان کو از سر نو حلت کے دائرے میں لائیں اور اسی طرح جن خبائث کو حلال ٹھہرا دیا گیا ہو ان کے گرد پھر حرمت کا جنگلہ کھڑا کر دیں۔ اور مزید یہ کہ فرائض اور ذمہ داریوں کے وہ بوجھ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، بلکہ کچھ دوسری طاقتوں کی طرف سے بنی آدم پر لاد دیئے گئے ہیں ان سے ان کو نجات دلائیں، اور غلط افکار و عقائد اور فاسد رسوم و قوانین کی جو زنجیریں ان کو جکڑ بند کئے ہوئے ہیں ان کا حلقہ حلقہ کاٹ کے رکھ دیں۔ اسی کا نام ہے تزکیہ۔ تزکیہ کا یہ جامع تصور ہے جو آج صرف قرآن اور اسلام ہی کے سرچشمہ سلمت سے ہاتھ آ سکتا ہے۔

یہی کام ہے جسے اصولی حیثیت سے خود قرآن نے کیا ہے، اور یہی کام ہے جسے تفصیلی حیثیت سے آنحضور نے اللہ کی طرف سے مامور کیے ہوئے مزکی کے منصب پر بیٹھ کر سرانجام دیا ہے۔

ناگزیر ہے کہ اس موقع پر ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کار تزکیہ کو چند مثالوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ بات تو محتاج دلیل نہیں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بستیاں چھوڑ کر جنگلوں میں دھونی نہیں رمائی، کوئی خانقاہ تعمیر کر کے لوگوں کو دعوت نہیں دی کہ دنیا کے کام کاج اور رشتے ناطے چھوڑ چھاڑ کر آؤ اور یہاں بیٹھ کر "ہو حق" کرتے رہو۔ ترک دنیا کے برعکس وہاں تو مردِ دنیا کی سب سے بھاری ذمہ داریاں خود اٹھائی گئیں اور دنیا کے دین سے اشتوائی گئیں۔ تزکیہ کا کام دنیا کی زندگی کے فرائض سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ لیا گیا ہے — اور ہر ہر گوشے اور ہر ہر پہلو میں کیا گیا۔

ذیل کی چند مثالیں واضح کریں گی کہ مختلف گوشوں میں تزکیہ کے تقاضے کس کس اسلوب سے پورے کیے گئے۔

پہلی مثال: سیرت انسانی اس ظاہری خول کا نام نہیں جسے آدمی سوسائٹی کو راضی کرنے کے لیے اپنے گرد ایک لباس کی طرح سجا لیتا ہے، بلکہ سیرت کا اصل جوہر وہ قلبی کیفیات ہیں جو آہستہ آہستہ ساری حرکات و سکنات کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ سیرت کے اصل جوہر اور اعمال کے بیرونی خول میں اگر منافات ہو تو یا تو خول سیرت کو اپنے مطابق بنا کے رہتا ہے، یا سیرت خول کو تار تار کر دیتی ہے۔

ضمیر اور اعمال کا تضاد دے کر دوامی زندگی بسر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس تضاد کی چکی اپنے پاٹوں میں انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ اس خطرے کا شعور انبیاء کو پوری طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کی پوری فکر کرتے ہیں کہ اسلامی سیرت لوگوں کے ضمیروں کے سرچشموں سے پھوٹے اور ایک ایک عمل کو سیراب کرے، نہ یہ کہ لوگ باہر کا ایک نسل آراستہ کر کے مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے زندگی بنا لی ہیکن ضمیر اور اعمال کا ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے انبیاء نے کبھی جھوٹ منتر سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے پیروؤں کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ارشاد رسالت:

عن عمر بن الخطاب،	حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔
قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
انما الاعمال بالنیات	اعمال (کی قدر و قیمت) کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔
وانما لامریء ما نوی	اور آدمی کے ہاتھ وہی کچھ پڑیگا جس کے لیے اس نے نیت کی۔
من کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ	جس کسی کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہو تو
فھجرتہ الی اللہ ورسولہ	اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوئی۔ اور جس
ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا	کسی کی ہجرت اس لیے ہو کہ وہ دنیا کمائے یا کسی عورت سے
اوامرأۃ یتزوجھا	شادی کر لے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہے جس کی
فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (مشکوٰۃ)	نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس ارشاد کے ذریعے امت کے مزکی اعظم نے اعمال کے پیچھے کام کرنے والی نیات و کیفیات کا تزکیہ کرنے کی سعی کی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ باتیں محض نظری رموز و نکات کے طور پر مجلس کی رونق بڑھانے کے لیے تو کہی نہیں گئی ہونگی۔ آنحضور صلعم کے سامنے ایسی مثالیں رہی ہونگی یا ایسے امکانات پیش آتے ہونگے کہ ہجرت کرنے والوں میں بعض لوگ کچھ دوسرے مقاصد دل میں رکھ کر وطن چھوڑیں، اور اپنے فعل کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی حیثیت بھی دیں۔ اس طرح تزکیہ کے ذریعے کی ادائی کا ایک میدان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آنحضور نے نیتوں کا تزکیہ کرنے کے لیے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ کے ہاں اجر صرف اس ہجرت کے لیے ہے جو صرف

اس کی رضا کے لیے کی گئی ہو۔

یہ حدیث صرف ہجرت ہی کے معاملے میں تزکیۂ نفس نہیں کرتی ہے، بلکہ جامع اور اصولی حیثیت سے اعمال کے بار آور ہونے کے لیے نیات کی تطہیر کو لازم قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو محدثین نے بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے اعمال اور دوسری خدمات کا تعلق ہے، مثلاً تعلیم و تعلم اور انفاق اور جہاد وغیرہ؛ ان سب کے بارے میں دوسرے موقعوں پر نبی کریمؐ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس کسی نے ان میدانوں میں کوئی بڑے سے بڑا کارنامہ بھی رضائے الٰہی سے صرف نظر کر کے طلب شہرت کے لیے سرانجام دیا تو آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

دوسری مثال | خدا پرستی کا یہ تصور کہ آدمی کو کام دھندوں سے، بدن کے فطری تقاضوں سے اور اعزہ و اقربا سے بے نیاز ہو کر نماز روزہ اور ذکر و تسبیح میں مگن رہنا چاہیے، خوب خوب پھیلا ہے اور بار بار پھیلا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی خدا پرستی کا یہ تصور موجود تھا اور اس کے مجسم نمونے کاہنوں اور پروہتوں اور راہبوں کی شکل میں موجود تھے۔ اس تصور کا پرتو شروع شروع میں آپ کے بعض بہترین صحابہ پر بھی پڑا۔ اس لیے آپ نے خدا پرستی اور عبادت کے تصور کا تزکیہ کرنے میں بڑی کاوشیں فرمائیں۔ ذیل کی روایت اس مقصد سے وابستہ ہے:

فانی انام واصلی واصوم وافطر وانکح النساء فاتق اللّٰہ یا عثمان! فان لاھلک علیک حقاً وان لضیفک علیک حقاً وان لنفسک علیک حقاً فصم وافطر وصلّ ونم (ابوداؤد)

میں سوتا بھی ہوں، اور نماز بھی پڑھتا ہوں، اور روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس اے عثمان! خدا سے ڈرو۔ کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے اہل و عیال کا بھی کچھ حق ہے اور تمہارے اوپر تمہارے مہمان کا بھی کچھ حق ہے، اور تمہارے اوپر تمہارا اپنا بھی کچھ حق ہے، پس روزہ رکھو تو افطار بھی کرو اور نماز پڑھو تو نیند بھی لو۔

اس ارشاد کے ذریعے ایک طرف آپ نے بدن اور روح کے تقاضوں میں توازن پیدا کرنے کا شعور دلایا ہے اور دوسری طرف عبادت اور خدا پرستی کے تصور کا تزکیہ کیا ہے۔ پھر آپ کا یہ فرمانا کہ اللہ سے ڈرو

یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنے نفس، اپنے اہل و عیال، اور اپنے مہمان کے حقوق کو پورا کرنے کے لیے وقت اور توانائیں صرف کرنا بھی اللہ سے تقویٰ کرنے ہی کا تقاضا ہے۔ اور اگر ادھر کا سارا وقت اور ادھر صرف ہونے والی توجہیں بھی اٹھا کر نماز روزہ کے زمانے میں ڈال دی جائیں تو اس طرح کی خدا پرستی اور دین داری خلاف تقویٰ ہے۔

تیسری مثال: صدقہ ایک اسلامی سماج کو بنانے اور مضبوط کرنے اور اس میں خوبیوں کو برقرار رکھنے کا نہایت ہی لازمی وسیلہ ہے، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین یہ ہے کہ علی کل مسلم صدقۃ۔ ہر مسلمان کو صدقہ دینا چاہیے۔ اس پر سوال کیا گیا :-

ان لم یجد؟ "اگر اس کے پاس کچھ ہو ہی نہیں تو؟"

فرمایا: یعمل بیدیہ فینفع نفسہ ویتصدق "ہاتھوں سے محنت کرے اور خود بھی نفع اٹھائے اور صدقہ بھی کرے"

پھر پوچھا گیا: ارأیت ان لم یستطع "کیا آپ نے غور فرمایا کہ اگر وہ اس کی طاقت ہی نہ رکھتا ہو تو کیا کرے"؟

فرمایا - یعین ذا الحاجۃ الملھوف "کسی مظلوم حاجت مند کی کوئی مدد ہی کرے"۔

پھر سوال ہوا، ارأیت ان لم یستطع "کیا آپ نے اس پر توجہ فرمائی کہ اگر یہ بھی اس کے بس میں نہ ہو تو"؟

فرمایا: یأمر بالمعروف او الخیر "دوسروں کو نیکی یا بھلے کام کی تلقین کرے"

پھر پوچھا گیا، ان لم یفعل؟ "اگر وہ ایسا بھی نہ کر پائے تو"؟

فرمایا: یمسک عن الشر فانہا صدقۃ "اپنے آپ کو برائی سے روک رکھے تو یہ بھی اس کی طرف سے صدقہ ہے۔" (الشیخان)

یعنی صدقہ جس معنی میں ہر مسلمان سے مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دوسرے بھائیوں اور اپنی سوسائٹی کے لیے اپنی جن جن قوتوں اور صلاحیتوں سے وہ کوئی مفید خدمت انجام دے سکتا ہو انجام دے۔ صدقہ روپے خیرات کرنے اور کھانا کھلانے تک ہی محدود نہیں ہے ورنہ یہ سعادت تو صرف دولت مند طبقہ کے لیے مخصوص ہو کے رہ جاتی۔ بلکہ صدقہ کا وسیع اسلامی تصور یہ ہے کہ آدمی میں ابنائے نوع اور اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کا ایک گہرا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے اور اس جذبے کے تحت جو مال رکھتا ہے وہ مال خرچ کرے،

جو مالی قوت رکھتا ہے وہ مالی قوت سے خدمات انجام دے، جو ہاتھ پاؤں سے کوئی خیر انجام دے سکتا ہے وہ ہاتھ پاؤں سے انجام دے، جو زبان سے دوسروں کے کام آسکتا ہے وہ زبان سے دوسروں کے کام آئے۔

چنانچہ آنحضورؐ نے اپنے دوسرے فرمودات میں واضح کیا ہے کہ راستے سے روڑے اور کانٹے ہٹا دینا، کسی کو بوجھ اٹھوا دینا، کسی کو راستہ دکھا دینا، بلکہ کسی سے خندہ روئی سے پیش آنا بھی صدقہ ہے۔

اس طرح کی احادیث کا منشا تصورِ صدقہ کا تزکیہ ہے۔ جہاں صدقہ کا یہ صحیح اور جامع تصور ذہن نشین ہوا وہاں صدقہ کی اسپرٹ اور اس کا جذبہ نشو ونما پانے لگے گا اور سوسائٹی پر فلاح کے دروازے کھل جائیں گے۔

چوتھی مثال | آنحضورؐ کی تحریک جب جہاد کے مرحلے سے دوچار ہوئی ہے تو اس مرحلے میں آکر نفسِ انسانی کے بہت سے قابلِ اصلاح پہلو ایسے سامنے آئے ہیں جو دوسرے مراحل میں کبھی نمایاں ہو ہی نہ سکتے تھے چنانچہ ایک طرف قرآن نے اور اس کے زیرِ ہدایت خود آنحضورؐ نے ان پہلوؤں کا تزکیہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ترمذی کی یہ حدیث بڑی قابلِ غور ہے:

من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات، مات ميتة الجاهلية، ومن قاتل تحت راية عمية يغضب لعصبية او يدعو الى عصبية فقُتل فقتلة جاهلية ..... الخ

جو کوئی اسلامی نظامِ اطاعت سے نکل گیا اور جماعت کے ڈسپلن سے باہر ہو گیا اور پھر وہ مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جو کوئی کسی نامعلوم جھنڈے کے نیچے لڑے اور جس کا سارا جوش قومی و نسلی عصبیت کی وجہ سے ہو، یا جو جہاد کے بجائے کسی عصبیت کی طرف بلاتا ہو اور پھر وہ مارا جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

یہ جہاد کی تنظیمی اور فوجی نظام اور میدانِ جنگ کی سرگرمیوں کا تزکیہ کیا جا رہا ہے۔ آنحضورؐ متنبہ فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کو بدنظمی اور ہلڑ سے منافات ہے۔ پھر واضح فرماتے ہیں کہ جنگ برائے جنگ کے اصول پر یا پیشہ ورانہ طریق پر، ہر جھنڈے کے نیچے جا لڑنے والا اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر نہ رکھنے والا سپاہی شجاعت کے جو جوہر بھی دکھاتا ہے جاہلیت کی راہ ہی میں دکھاتا ہے اور مرتا ہے تو کفر پر مرتا ہے۔ اسی طرح وہ جنگجو جس کا سارا جوشِ جنگ کسی قومی و نسلی عصبیت کا نتیجہ ہو، یا جو ایسی کسی عصبیت کی طرف پکارتا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مرے گا تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو کر نہیں مرے گا۔ بلکہ کفر کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھے گا!

پانچویں مثال | قرآن مسلم سوسائٹی کو زنا سے پاک رکھنے کے لیے اصولی طور پر کہتا ہے کہ لا تقربوا الزنا۔ یعنی زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ معاملہ اتنا نازک ہے کہ نہ صرف زنا کرنے کی حد تک نہیں، اس سے دور بھاگنے کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زنا کے کچھ مبادیات، کچھ متعلقات اور کچھ موجبات ہیں کہ جن سے قرآن روکنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ "فتنۂ نظر" سے خبردار کرکے غض بصر کا حکم دیتا ہے، لیکن مبادیات زنا صرف فتنۂ نظر تک ہی محدود نہیں ہیں، ان کا دائرہ تو وسیع ہے۔ قرآن اس دائرہ کے اندر آنے والے ہر ہر فتنہ کا جدا جدا ذکر نہیں کرتا۔ پھر بھی اس کی تعلیم ان سب کو جامع ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے منشا کی وسعتوں کو سمجھ کر سوسائٹی کے دائرہ منفیات کے تزکیہ کے لیے وہ ساری باتیں مکمل کر دی ہیں جنہیں قرآن کا معجزانہ اجمال اپنے سینے میں لیے ہوئے تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مشہور روایت میں وارد ہے کہ:

— فزنا العینین النظر — سو آنکھوں کی زنا (بری نظر سے) دیکھنا ہے۔

وزنا اللسان المنطق — اور زبان کی زنا (شہوت بھری) گفتگو ہے۔

والنفس تمنی وتشتہی — اور نفس (کی زنا یہ ہے کہ وہ) تمنا اور خواہش کرتا ہے۔

والفرج یصدق ذالک او یکذبه — اور بالآخر (جنسی اعضا) یا تو اس کی تصدیق کر دیتے ہیں یا تکذیب؟

مسلم کی روایات میں بھی آتا ہے کہ ہاتھ کی زنا اس کا شہوت سے چھونا اور پکڑنا ہے اور پاؤں کی زنا زنا کے لیے چل کر جانا ہے۔ ابو موسیٰ کی ایک روایت میں جسے ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے لیا ہے "فتنۂ خوشبو" کا ذکر ملتا ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ:

وان المراۃ اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهی کذا وکذا۔ — اور جب کبھی کوئی عورت عطر لگا کر کسی مجلس میں آتی ہے تو وہ ایسی ویسی ہے۔

ان روایات کو سن کر ہر انصاف پسند یہ کہے گا کہ واقعی اگر کسی سوسائٹی کا زنا سے پورا پورا تزکیہ کرنا مطلوب ہو تو زنا کے ان سارے ہی مبادیات و محرکات کا سدِباب کرنا ہوگا۔ اور یہی رسول اللہ نے کیا۔ لیکن کیا کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ صنفی تزکیہ کے ان سارے تفصیلی تقاضوں کا قرآن میں صراحتہً ذکر موجود ہے؟ یقیناً نہیں۔ پھر وہ اتھارٹی کونسی ہے جو فتنۂ چشم و گوش، فتنۂ خوشبو، فتنۂ مساس اور فتنۂ رفتار کا سدِباب کرنے والی ہے؟

وہ اختیار تیٔ مزکیٔ اعظم کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس خاص منصب تزکیہ پر مامور کیا گیا ہے ۔

چھٹی مثال | قرآن تجارتی معاملات کے لیے ایک اصولی اخلاق سکھاتا ہے لیکن وہ مفصّل معاملات پر ان کو منطبق کر کے نہیں دیتا۔ یہ کام خدا کا نبی انجام دیتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ نے جو اسلامی قانونِ بیع و شراء نافذ فرمایا تھا اس میں سے ہم یہاں ایک مثال دیتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ:۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودے کرنے سے روکا۔

یہ اور دوسرے احکام بیع و شراء جو نبی صلعم نے دیئے ان کا مقصود تاجروں کو اخلاقِ اسلامی سے آراستہ کرنا اور مارکیٹ کا تزکیہ کرنا ہے۔ ان میں سے کوئی حکم قرآن سے نہیں ٹکراتا، بلکہ درحقیقت قرآن کے بتائے ہوئے اخلاقی اصولوں کا فطری تقاضا قرار پاتا ہے اور قرآن کی مطلوبہ پُرامن سماجی فضا بغیر ان احکام کو اختیار کیے قائم ہو ہی نہیں پاتی۔

ساتویں مثال | اسلام ایک ایسی تحریک ہے جو آزمائشوں کی کٹھن وادیوں سے ہو کر گذرتی ہے۔ وہی بات کہ

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہاں قدم قدم پر مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اہلِ ایمان کو اس طرزِ عمل کی تعلیم بھی دی جو نزولِ مصائب کے وقت اختیار کیا جانا چاہیے۔ کہیں بتایا کہ ایسی حالت میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ کہیں صبر و صلوٰۃ کو مصائب کی ناوک اندازیوں کے مقابلے میں ڈھال قرار دیا، کہیں تعوذ کی تعلیم دی اور کہیں یہ سکھایا کہ مصیبت آنے پر اس حقیقت کا شعور ذہن میں تازہ کیا جائے کہ ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف ہم پلٹ کر جاتے ہیں۔ جہاد کے مراحل میں سے جب تحریک گذری اور طلبگارانِ شہادت موت کے گھاٹ اُترے تو قدرتی طور پر اُن کے لواحقین کو صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ عرب میں رواج تھا جیسا کہ پنجاب کے دیہات میں آج بھی رواج ہے کہ عورتیں مُردوں پر خاص اہتمام سے نوحہ کرتی تھیں، بین کرتی تھیں، بال نوچتی تھیں اور کپڑے پھاڑتی تھیں۔ مدینہ میں جب جاہلیت کی ان روایات کا ظہور ہوا تو ایک طرف قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی کہ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ یعنی شہدائے راہِ حق کی موت عام لوگوں کی سی

موت نہیں ہے اور ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان کے بارے میں یہ کہنا ہی اللہ تعالیٰ کو ناگوار ہے کہ وہ مر گئے یا وہ "مردہ ہیں" ـــــ وہ تو اپنے آقا کے حضور سے ایک حیاتِ نو کا خلعت پا کر سرفراز ہیں۔ دوسری طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نوحہ کرنے کی ممانعت کی سو ان پر ہی نہیں، بلکہ کسی بھی میت پر جاہلی طریقے کا ماتم کرنا ممنوع ٹھیرا دیا۔ فرمایا:

لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب و دعی بدعوی الجاھلیۃ — جس نے منہ پیٹا، گریبان پھاڑا اور جاہلی طریق پر واویلا کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

یہ رسوم کا تزکیہ تھا یا یوں کہیے کہ غم کرنے اور ماتم کرنے کا تزکیہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے لختِ جگر کی موت پر ایک عبدِ مسلم کے اظہارِ غم کا نمونہ قائم کر کے دکھا دیا۔ یہ ہدایت اس صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں ملتی، مگر قرآن کی تعلیم اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ من گھڑت بات نہیں کہہ دی، بلکہ منصبِ تزکیہ پر فائز ہو کر اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے فرمائی ہے۔ اسے کسی مجتہد کا اجتہاد اور کسی محقق و مفکر کی تفسیرِ قرآن بدل نہیں سکتی اور اس کی جگہ کسی دوسرے کا کوئی قول حجت نہیں بن سکتا۔

آٹھویں مثال حضرت ابوبردہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے دادا حضرت ابوموسیٰ کو اور حضرت معاذ کو مامور کر کے یمن بھیجا تو ذیل کی ہدایت دی:

یسّرا ولا تعسّرا — لوگوں کو سہولتیں دینا، ان کو تنگی میں نہ ڈالنا،

وبشّرا ولا تنفّرا — ان کو بشارت دینا، نفرت نہ دلانا،

وتطاوعا ولا تختلفا — آپس میں موافقت کرنا، پھوٹ میں نہ پڑ جانا۔

یہ اسلامی حکومت کی اصول سرکس کے لیے داخلی پالیسی کا چارٹر ہے۔ اس کا مقصود نظامِ حکومت و سیاست کا تزکیہ ہے یعنی جس نظامِ حکومت و سیاست میں یہ چیزیں ملحوظ نہ رکھی جائیں گی اس کا نشوونما کبھی بھی اسلام کے حسبِ منشا صحیح خطوط پر نہ ہو سکے گا۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن میں یہ الفاظ کہیں نہ ملیں گے۔ لیکن قرآن نے مسلمان اربابِ حکومت کے لیے جو اصولی ہدایات دی ہیں ان کو جمع کر کے جب آپ دیکھیں گے تو یہ فرمانِ نبوت ان کے فریم میں بالکل ٹھیک بیٹھ جائے گا، کیونکہ آنحضورؐ نے اس کو اخذ قرآن ہی سے کیا ہے۔

اور باریک اور گہرے اشاروں کو صراحت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ قرآن نظامِ سیاست کا جو تزکیہ چاہتا ہے عقل گواہی دیتی ہے کہ وہ اس فرمانِ رسالت کے بغیر عمل میں نہیں آتا۔ بس یہ پالیسی اسلامی حکومت کی اٹل پالیسی قرار پائے گی اور اسے وقتی اور اجتہادی امر قرار دے کر رد کرنے کی جرأت کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔

نویں مثال مشہور حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی اگر منکر کو عمل میں آتے دیکھے تو اسے ہاتھ سے روک دے، یہ اس کے بس میں نہ ہو تو زبان سے اس کے ازالہ کی کوشش کرے، اور اگر یہ بھی اس کے بس سے باہر ہو تو کم سے کم اس سے دلی نفرت کرے۔ یہ آخری درجۂ ایمان ہے۔

قرآن میں صرف اصولی تعلیم یہ ملتی ہے کہ معروف کو قائم کرو اور منکر کو مٹا دو۔ یہاں جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ بہر حال قرآن میں مذکور نہیں ہے لیکن غور فرمائیے کیا یہ قرآن سے متعارض ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ کسی بھی اصول پر قائم ہونے والی سوسائٹی کو اس کے اصولوں پر استوار رکھنے کے لیے بالکل عقلی طور پر یہ لازم آتا ہے کہ اس کا ایک ایک فرد اُن قدروں کا نگہبان ہو جن قدروں سے اس کی بقاء وابستہ ہے اور ان مفاسد کے مقابلے میں وہ سماج کے حلقے کا سنتری بن کے کھڑا رہے جو اس کی تباہی کے لیے حملہ آور ہوتے ہوں۔ وہ سوسائٹی میں اپنے منصب کے لحاظ سے اگر ہاتھ کی طاقت (اختیارات) رکھتا ہو تو ان کو استعمال کرے، اور اگر ہاتھ کی قوت نہ رکھتا ہو تو زبان اور قلم کی طاقتوں سے کام لے، اور اگر یہ بھی نہ رکھتا ہو تو جذبۂ نفرت کے ذریعے مفاسد کا مقابلہ ضرور کرتا رہے۔ جن لوگوں میں خیر کی پاسبانی اور شر کے مقابلے کی تحریک ہی باقی نہ رہے، وہ ایمان کے آخری درجے سے بھی نیچے چلے گئے۔ دل گواہی دیتا ہے، عقل اعتراف کرتی ہے، تجربہ تصدیق کرتا ہے کہ آنحضور کا یہ ارشاد حق ہے اور صد فیصد حق ہے۔ بغیر اس ارشاد پر کاربند ہوئے کبھی ہم سوسائٹی کا مجموعی تزکیہ نہیں کر سکتے۔ یہ ارشاد اجتماعی فضا کے تزکیہ کا اہم ترین تقاضا سامنے لاتا ہے۔ قرآن اس ارشاد کو گلے لگاتا ہے، اس کی تعلیم اس کی پشت پناہی کرتی ہے، اس کی حکمت اس کے آئینے میں پوری طرح منعکس ہے۔

نگاہِ بازگشت یہ حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ پورے کا پورا دین —— سارا قرآن اور سارا دفترِ حدیث —— نظامِ تزکیہ ہے۔ ہر آیت اور ہر روایت تزکیۂ انسانی کے لیے وارد ہوئی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ مذکورۂ بالا متفرق مثالوں پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال کر اس حقیقت کا ادراک کریں کہ قرآن اپنی تعلیم کے ذریعے

تزکیۂ انسانی کے لیے اصولی ہدایات دینے کے بعد روزمرہ زندگی کے عملی مسائل میں تزکیہ کا تفصیلی کام سرانجام دینے کا بار اپنے لانے والے پر ڈال دیتا ہے، کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر مامور ہے کہ انسانوں کا تزکیہ کرے — ان کے خیالات کا، ان کے عقاید کا، ان کے اخلاق کا، ان کے معاملات کا، ان کی سیاست کا، ان کی معاشرت کا، ان کی رسوم کا، ان کی جماعت بندی کا! وہ چمنِ حیات کی ایک ایک روش کو درست کرے، ایک ایک درخت کی شاخ تراشی کرے، اور ایک ایک ٹہنی کی نشوونما کے لوازم بہم پہنچائے۔ تزکیۂ انسانی کے لیے اوپر جتنے بھی اقوال و احکام پیش کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی من و عن قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی قرآن سے متعارض یا مخالف نہیں ہے، بلکہ ان سے صرفِ نظر کر کے خود قرآن کی اصولی ہدایات کا منشا پورا کرنا اور کسی سماج کو اسلامی خطوط پر نشوونما دینا ممکن نہیں ہے۔ ان ارشاداتِ رسالت کے اندر قرآن بول رہا ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ کی نقل نہیں ہیں مگر یہ قرآن ہی کے معانی و مطالب کا حاصل ہیں۔ یہ عین قرآن نہیں، مگر یہ غیر قرآن بھی نہیں! جس خدا نے قرآن کو تزکیۂ انسانی کے لیے سرچشمۂ ہدایت قرار دیا، اسی خدا نے خود اسی قرآن کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مزکی بنا کر آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ کام کا وہ حصہ جو کتاب کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ ایک صاحبِ کتاب اور حاملِ کتاب کے کرنے کا ہے، اسے آپ بہ نفسِ نفیس سرانجام دیں۔ جیسی اتھارٹی اس طرف ہے، ویسی اتھارٹی اس طرف ہے۔ جو "سلطان" کتاب کے لیے وارد ہوا ہے وہی "سلطان" رسول کے لیے بھی وارد ہے۔ جیسی سند قرآن کو مستند بناتی ہے ویسی ہی سند رسول کو سند بنانے والی ہے۔ پس رسولؐ نے ایک مزکی ہونے کی حیثیت میں جو جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں اور جن جن عملی تدابیر کو اختیار فرمایا ہے وہ شریعتِ اسلامی اور نظامِ دینی کے مستقل اجزا ہو گئے۔ اب نہ کوئی ان کو ترک کرنے کا مجاز ہے، نہ بدلنے کا، نہ ان کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کا! ان کا قبول و اتباع لازمۂ ایمان و اسلام ٹھیرا۔

اب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ رسول نعوذ باللہ محض قاصد بن کر نہیں آتا بلکہ وہ کتاب کی تبیین کا ذمہ دار بن کر آتا ہے اور تبیینِ کتاب کے جامع فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفوس کے چہارگانہ مناصب پر من جانب اللہ مامور ہوتا ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ ان چہارگانہ ذمہ داریوں کے علاوہ رسول اللہ کے اوپر اور بھی امورِ مہمہ کی انجام دہی کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے۔ (باقی آئندہ)